تاثرات

پاکستان اقبال کی نظر میں

۲۱ اپریل کو حسب معمول یوم اقبال ملک کے ہر گوشے میں منایا گیا۔ تقریریں ہوئیں۔ اشعار پڑھے گئے۔ اور رنگا رنگ کے پروگراموں سے اس تقریب کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ اقبال کی حیثیت ہمارے ہاں صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی کی نہیں ہے کہ جس کے رنگِ کلام سے شعر و فکر اور ذوق و نگاہ کو زندگی عطا ہوئی ہو۔ اور جس کے تخلیقاتِ فنی سے ادبیات کو نئی دولت نئی سمتیں اور نئی روشنی ملی ہو، بلکہ ایک حکیم کی بھی ہے کہ جس نے ہمارے عروج و زوال کے پورے نقشہ پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ اور ہم پر اسرارِ حیات کی پیچیدہ گرہوں کو کھولا ہے۔

اقبال وہ شخص ہے کہ جس کی چشمِ بصیرت نے مشترکہ ہندوستان میں اسلام کے موقف کو کمزور پایا اور یہ محسوس کیا کہ اگر قومیت متحدہ کی آندھیاں اسی زور شور سے چلتی رہیں، اور مسلمانوں نے اپنی بقا کے لئے علیحدہ اور منفرد نوعیت کی مساعی کی طرح نہ ڈالی تو ان کو اکثریت کے رحم و کرم پر جینا ہوگا۔ اور اسلامی تہذیب ثقافت کے اس قیمتی ورثہ سے دست بردار ہونا ہوگا کہ جس کی حفاظت کا یہ اب تک دم بھرتے آئے ہیں۔ اقبال نے نہ صرف ان خطرات کو شدت سے محسوس کیا، جو ہندو سامراج سے لازماً ابھرنے والے تھے۔ اور ان تلخ نتائج کی نشاندہی کی کہ جو قومیت متحدہ کے روپ میں مسلمانوں کے سامنے آنے والے تھے۔ بلکہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کی عملی تدبیریں بھی کیں۔ یعنی اس وقت جب کہ کانگرس کا سارے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔ اور خود مسلمانوں کے عظیم و لائق احترام لیڈروں کی ساری جدوجہد اس خود فریبی پر مرکوز تھی کہ بہر حال انگریزی استعمار کو زک پہنچانی چاہئے اور اس کے پنجۂ استبداد سے رہائی حاصل کرنا چاہئے۔ علامہ نے اسلامی سیاست میں انفرادیت کا علم سنبھالا اور پاکستان کا تصور پیش کیا اور بتایا کہ آزادی سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کن شرائط پر حاصل کی جائے۔ اور اس آزادی میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہو؟ اس وقت پاکستان کا تصور افلاطون کے یوٹوپیا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا اور ایک شاعر کے حسین خواب سے زیادہ اس کی اہمیت نہ تھی۔ علامہ نے اس کو کچھ ایسے اذعان اور دل آویزی سے پیش کیا کہ یہ نعرہ مسلمانوں کی آئندہ جدوجہد کا مرکزی نقطہ قرار پایا۔ اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک خواب ایک خیال اور یوٹوپیا نے کیونکر ایک حقیقت، ایک واقعہ اور عظیم الشان انقلاب کی شکل اختیار کر لی۔ اور سچ مچ

ایک ایسی مملکت معرضِ ظہور میں آگئی کہ جہاں اسلامی تصورات کی روشنی میں زندگی کا ایک نیا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے۔ کہ کیا پاکستان سے مراد علامہ کی صرف ایک خطہ ارض پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ اور اُنہوں نے جب یہ خواب دیکھا تھا۔ تو ان کے نزدیک اس کا مطلب یہی تھا کہ کسی نہ کسی جگہ تو مسلمانوں کو بھی سیاسی اقتدار پر بلا شرکت غیرے قبضہ جمانے کا موقع ملنا چاہیئے۔ اور ہندوستان میں کچھ علاقے تو ایسے ہونے چاہئیں کہ جہاں یہ اکثریت کے بل بوتے پر اپنی من مانی کارروائیاں کر سکیں۔ اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں۔ علامہ اقبال نے جب پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اس وقت جغرافیائی و اقلیمی آزادی سے کہیں زیادہ اِن کے سامنے جو چیز تھی، وہ اسلام کے خاص نظریات کی آزادی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہم نہایت آسانی سے اسلامی تہذیب و تمدّن کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہو سکیں گے۔ اور زندگی کے اس اچھوتے نصب العین میں، جو پاکیزگی، بلندی اور گہرائی ہے اس سے کما حقہٗ استفادہ کر سکیں گے۔ اقبال کا شمار مسلمانوں کے اُن مصلحین میں ہوتا ہے۔ جو اسلام کے بارہ میں مایوس نہیں ہیں۔ اور جو یہ سمجھتے ہیں، کہ اس کو ابھی بہت سے کمالات کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اور حیاتِ انسانی کو آگے بڑھانے اور چمکانے کے سلسلہ میں اہم خدمات انجام دینا ہے۔ اقبال اسلام کے ماضی پر قانع نہیں ہیں۔ اور اس بات پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، کہ اس کی فیض رسانیوں کے دروازے نوعِ انسانی پر بند ہو چکے ہیں، اور اس کے کارہائے نمایاں کا بہترین دور گذر چکا ہے! ان کے نقطہ نظر سے خاک کے اس ڈھیر میں ہنوز ایسے شرارے باقی ہیں، جنہیں سپہر کبود پر آفتاب بن کر چمکنا ہے۔ اور فکر و تصوّر کی دنیا کو نئی روشنی اور نئی حرارت سے آشنا کرنا ہے۔ اس بناء پر علامہ کا تصوّرِ پاکستان ہرگز اس درجہ عامیانہ نہیں ہو سکتا، کہ جس میں ہوسِ اقتدار اور تقسیم اقتدار کے سوا اور کوئی ہنگامہ بپا نہ ہو۔ اور کرسئ وزارت سے آگے سعی و تدبیر کی اور کوئی منزل نہ ہو۔ حکومت مسلمانوں نے پیٹ بھر کر کی ہے، اور از حجاز تا بہ سمرقند ثروت و سطوت کے مزے لوٹے ہیں۔ اور پھر پاکستان کے علاوہ اس گئے گذرے دور میں بھی متعدد ایسی راجدھانیاں موجود ہیں کہ جہاں زمین صرف مسلمانوں کے تعیشات کے لئے سونا اُگلتی ہے اور جواہرات نچھاور کرتی ہے۔ اس لئے ان تماشوں میں کم از کم ان لوگوں کے لئے تو دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہو سکتا، کہ جو مسائلِ حیات پر ایک خاص نقطۂ نظر سے غور کرنے کے عادی ہیں۔

اقبال کی نظر میں پاکستان ایک ملک، اور ایک ریاست سے زیادہ ایک نظریہ ہے۔ ان کی رائے میں اسلام کے ممکنات ارتقاء کے لئے ایک ایسے میدان، ایسے کارگاہِ حیات، اور ایسے کارخانہ کی ضرورت ہے، جہاں بالکل ہی نئے انداز کے قلب و ذہن ڈھلیں، جہاں ضمیرِ انسانی محکومی و تقلید کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو اور صرف اپنی خودی سے تعلق پیدا کرے، جہاں مغربی علوم و فنون کی ضیا پاشیاں نظر و بصر کی چکاچوند کا باعث نہ ہوں، جہاں ظاہر کی ٹیم ٹام کے ساتھ باطن کی جلوہ افروزیاں بھی پائی جائیں۔ جہاں ایک جیتی جاگتی اور متحرک تہذیب کے آثار و نتائج تو محسوس

ہوں۔ مگر قلب و نظر کا فساد نہ ہو۔ جہاں معاشرہ کی بنیاد اور روح عفاف و پاکیزگی پر ہو فسق و فجور پر نہ ہو۔ اقبال کی رائے میں اسلام کے دامن اجتماعیت میں ایسے زرّیں اصول پائے جاتے ہیں کہ جن کو اب تک آزمایا نہیں گیا۔ اور جن کی روشنی میں معاشرہ کی تشکیل نہیں کی گئی، اور وہ اصول بجائے خود ایسے منصفانہ، ایسے قرینِ عقل اور متوازن ہیں۔ کہ ان کو مانے بغیر بندہ و خواجہ کی تفریق مٹ نہیں سکتی اور انسان انسان کی بندگی سے رستگاری حاصل کر نہیں سکتا اور نہ مرد و زن کو وہ مقام ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جن سے تدبیرِ منزل کی تمام پیچیدگیاں خود بخود دور ہو سکیں۔

اقبال صحت مند معاشرہ اور تربیتِ افراد پر بہت زور دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ پاکستان کے عنوان کے تحت آپکو اس نوع کی تصریحات ایک ساتھ اقبال کے کلام میں کہیں نظر نہ آئیں۔ لیکن جو شخص بھی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اقبال کے تفصیلی نظریات و افکار کیا ہیں۔ اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں خصوصیت سے کن خیالات کے حامی ہیں، وہ اس بات کی تائید کرے گا، کہ انہوں نے جب پاکستان کا نعرہ بلند کیا اور تمام مسلمانوں نے اس پر لبیک کہا، تو اس سے ان کی توقع یہ نہیں تھی کہ کابل، ایران، سعودی عرب، اور مصر و عراق کی مملکتوں کی طرح ایک مملکت کی داغ بیل ڈالی جائے، کہ جس میں مسلمانوں کو کارفرمائی کی پوری پوری آزادی حاصل ہو۔ بلکہ وہ ایک مثالی اور نظری مملکت کے خواہاں تھے۔

اس سلسلہ میں اقبال دو بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں چاہتے تھے۔ ایک نظامِ تعلیم و تربیت میں اور دوسرے نظامِ معاشرہ میں۔ موجودہ مغربی تعلیم سے وہ قطعی مطمئن نہیں تھے، اور اس کے بارہ میں ان کا سوءظن بالکل بجا تھا کہ یہ زندگی کے حقیقی مقتضیات سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، اور یہ کہ اس کا نتیجہ سوزِ دماغ تو ہے، مگر وہ سوزِ جگر جس کی کہ ہمیں ضرورت ہے، وہ اس سے پیدا ہونے والا نہیں۔ ان کے نزدیک اس تعلیم سے بلاشبہ عیش و دولت کی فراوانی تو آتی ہے، اقتدار و حکومت کی خدمت گذاری کے اعلیٰ مواقع بھی اُبھرتے ہیں۔ اور ایک طرح کی لذّت و نشہ بھی ہے، مگر اپنا سراغ نہیں ملتا، ملی انا کا پتہ نہیں چلتا اور افراد کو یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ ہمارا مزاج خاص کن کن اصلاحات کا مقتضی ہے؟ ان کے نزدیک موجودہ تعلیم سے دانش و فکر میں تو اضافہ ہوتا ہے۔ مگر دقتِ نظر اور وسعتِ فکر کا سامان اس میں نہیں۔ اس لئے یہ یکسر بدل دینے کے لائق ہے۔

اسی طرح علامہ فقہِ جدید کی روشنی میں اسلامی معاشرہ کی ازسرِنو تشکیل چاہتے تھے اور اس کے لئے ایک متعین خاکہ بھی رکھتے تھے، جس کی نشاندہی انہوں نے اپنے خطبات میں جا بجا کی ہے۔ اور اگر ہم یہ کہیں تو اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ آخر آخر میں تو اس مسئلہ نے ایک دھن کی شکل اختیار کر لی تھی، جو ہر وقت ان پر سوار رہتی تھی۔ کہ کسی طرح مسلمان قرآن میں غوطہ زن ہوں، اس کے احکام و مسائل کا تحقیقی اور انقلابی جائزہ لیں، اس کی روح معلوم کرنے کی کوششیں کریں اور یہ دیکھیں کہ اس کی مدد سے کیونکر ایک حرکت پذیر (DYNAMIC) فقہ کی تعمیر

ممکن ہے۔ ان کی رائے میں پرانی فقہ میں چونکہ یہ نقص ہے کہ اس میں نئے حالات و تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت نہیں۔ اور یہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ معاشرہ ساکن ہے۔ اور تیرہ چودہ صدیوں میں ادھر حالات و واقعات میں کوئی اہم تغیر رونما نہیں ہوا۔ اس لئے اس میں جزوی تبدیلیوں سے کام چلنے والا نہیں۔ بلکہ اصلاح احوال کے لئے جرأت مندانہ اجتہاد کی ضرورت ہے۔ ایسے اجتہاد کی کہ جس میں فاروقؓ کی سی جرأت فکر اور ابوحنیفہؒ کی سی اصابت رائے اور شافعیؒ و مالکؒ کا سا ذوقِ روایت و حدیث سب یکجا ہوں۔ اور ایسا مجموعہ مسائل مرتب ہو کہ جو ہماری ضروریات کا کفیل بھی ہو اور جس کو فخر کے ساتھ دوسروں کے سامنے ہم پیش بھی کر سکیں۔

یہ ہے پاکستان کا تصور اقبال کی نظر میں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہر سال یوم اقبال مناتے وقت کبھی ہم نے سوچا ہے کہ ان معنوں میں پاکستان کتنے قدم آگے بڑھ پایا ہے اور نو سال کے اس طویل عرصہ میں ہمارے نظام تعلیم میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اور ہمارے معاشرہ میں کن کن اصلاحات نے جنم لیا ہے؟ اگر پوری قوم نے اس تقریب کے اس پہلو پر غور نہیں کیا ہے، تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس کا موقع کب آئے گا؟ اور کب ہم اس لائق ہونگے کہ اپنے اہم مسائل پر غور و فکر کریں۔

محمد حنیف ندوی